روزہ! انسانی سیرت کی تعمیر کے لیے نسخہ اکسیر

مولانا محمد مجیب الدین قاسمی (ایم اے)

''روزہ'' زکوٰۃ اور حج کی طرح ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے؛ بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب قریب وہی ہے جو رکن صلوٰۃ کا ہے اسے رکنِ صلوٰۃ کے ساتھ مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے، ان کا کام ہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے، جو نماز سے انسان کی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، نماز روزمرہ کا معمولی نظام تربیت ہے جو ہر روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے اور تعلیم وتربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دیکر چھوڑ دیتا ہے اور روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا غیر معمولی نظام تربیت ہے، جو آدمی کو تقریباً سات سو بیس گھنٹوں (۷۲۰) تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجہ میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزآنہ معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے وہ شدید ہوجائیں، یہ غیر معمولی نظامِ تربیت کس طرح اپنا کام کرتا ہے اور کس کس ڈھنگ سے نفسِ انسانی پر اثر ڈالتا ہے؟ اس کا تفصیلی جائزہ ہم ان سطروں میں لینا چاہتے ہیں:

روزے کے اثرات: روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب میں طلوعِ سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہوجاتا ہے اور غروبِ آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے اور اس دوران میں پانی کا قطرہ اور خوراک کا ایک ریزہ قصداً حلق میں اُتارنے کی اجازت نہیں ہوتی اور زوجین کے لیے ایک دوسرے سے قضائے شہوت کرنا بھی حرام ہوتا ہے؛ پھر شام کو ایک خاص وقت آتے ہی اچانک حرمت کا بند توڑ دیا جاتا ہے، وہ سب چیزیں جو ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں یکا یک حلال ہوجاتی ہیں اور رات بھر حلال رہتی ہیں؛ یہاں تک کہ دوسرے روز کی مقررہ ساعت آتے ہی پھر حرمت کا قفل لگ جاتا ہے، ماہِ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے؛ گویا پورے تیس دن آدمی شدید ڈسپلن کے تحت رکھا جاتا ہے، مقررہ وقت تک سحری کرنے، مقرر وقت پر افطار کرنے، جب تک اجازت ہے اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرتا رہے اور جب تک اجازت سلب کرلی جائے تو ہر اس چیز سے رُک جائے جس سے منع کیا گیا ہے۔

احساسِ بندگی: اس نظامِ تربیت پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے نظر آتی ہے وہ یہ کہ اسلام اس طریقہ سے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اعتراف واقرار کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس شعور کو اتنا طاقتور بنادینا چاہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی وخودمختاری کو اللہ کے آگے بالفعل تسلیم کرلے، یہ اعتراف وتسلیم ہی دراصل اسلام کی جان ہے اور اسی پر آدمی کے مسلم ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے، دینِ اسلام کا مطالبہ انسان سے صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ بس خداوندِ عالم کے وجود کو مان لے یا محض ایک مابعد الطبیعی نظریہ کی حیثیت سے اس بات کا اعتراف کرلے کہ اس کائنات کے نظام کو بنانے اور چلانے والا صرف ایک اللہ واحد قہار ہے؛ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اس امرِ واقعی کو ماننے کے ساتھ ہی اس کے منطقی اور فطری نتیجہ کو بھی قبول کرلے، یعنی جب وہ یہ مانتا ہے کہ اس کا اور تمام دنیا کا خالق پروردگار قیام بخش اور مدبر امر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جب وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ تخلیق میں کوئی اللہ کا شریک نہیں، نہ پرورش میں، نہ قیام بخشی میں اور نہ تدبر امر میں؛ تو اس تسلیم واعتراف کے ساتھ ہی اسے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت وفرمانبرداری کے آگے سپر ڈالدینی چاہیے، اپنی آزادی وخودمختاری کے غلط ادعا سے خیال اور عمل دونوں میں دست بردار ہونا چاہیے اور اللہ کے مقابلہ میں وہی رویہ اختیار کرلینا چاہیے جو ایک بندے کا اپنے مالک کے مقابلہ میں ہونا لازمی ہے؛ یہی چیز دراصل کفر اور اسلام کے درمیان فارق ہے، کفر کی حالت اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں خودمختار اور غیر جوابدہ سمجھے اور یہی سمجھ کر اپنے لیے زندگی کا راستہ اختیار کرے اور اسلام کی حالت اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کے سامنے جوابدہ سمجھے اور اسی احساسِ بندی اور ذمہ داری کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کرے؛ پس حالتِ کفر سے نکل کر حالتِ اسلام میں آنے کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا سچا اور قوی اقرار ضروری ہے اسی طرح اسلام میں رہنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں بندگی کا احساس وشعور ہر دم تازہ، ہر وقت زندہ اور ہر آن کارفرما رہے؛ کیونکہ اس احساس وشعور کے دل سے دور ہوتے ہی خودمختاری وغیر ذمہ داری کا رویہ عود کر آتا ہے اور کفر کی وہ حالت پیدا ہوجاتی ہے جس میں آدمی یہ سمجھتے ہوئے کام کرتا ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ اس کا حاکم ہے نہ ہی اسے اللہ تعالیٰ کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔

نماز کا اوّلین مقصد انسان کے اندر اسلام کی اسی حالت کو پے در پے تازہ کرتے رہنا ہے اور یہی روزے کا بھی مقصد ہے؛ مگر فرق یہ ہے کہ نماز روزانا تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اس کو تازہ کرتی ہے اور رمضان کے روزے سال بھر میں ایک مرتبہ پورے ۲۰/۷ گھنٹوں تک پیہم اس حالت کو آدمی پر طاری رکھتے ہیں؛ تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ دل و دماغ میں بیٹھ جائے اور سال کے باقی گیارہ مہینوں تک اس کے اثرات قائم رہیں، اوّل تو روزہ کے سخت ضابطہ کو اپنے اوپر محفوظ کرنے کے لیے کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہی نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا حاکم اعلیٰ نہ سمجھتا ہو اور اس کے مقابلہ میں اپنی آزادی و خودمختاری سے دست بردار نہ ہو چکا ہو؛ پھر جب وہ دن کے وقت مسلسل بارہ تیرہ گھنٹے کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رُکا رہتا ہے اور جب سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نفس کے مطالبات سے یکا یک ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور جب افطار کا وقت آتے ہی نفس کے مطالبات کی طرف اس طرح لپکتا ہے کہ گویا فی الواقع ہاتھوں اور اس کے منہ اور حلق پر کسی اور کی حکومت ہے جس کے بند کرنے سے وہ بند ہوتے ہیں اور جس کے کھولنے سے وہ کھلتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دوران میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اپنی بندگی کا احساس اس پر ہر وقت طاری رہا ہے، اس پورے مہینے کی ایک طویل مدت میں یہ احساس اس کے شعور یا تحت الشعور سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا؛ کیونکہ اگر غائب ہو جاتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ضابطہ کو توڑنے سے باز رہ جاتا۔

اطاعتِ امر: احساسِ بندگی کے ساتھ خود بخود جو چیز لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہا ہے، اس کے حکم کی اطاعت کرے، ان دونوں چیزوں میں ایسا فطری اور منطقی تعلق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہی نہیں ہو سکتے نہ ان کے درمیان کبھی تناقض کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے، اس لیے کہ اطاعت دراصل نتیجہ ہی اعترافِ خداوندی کا ہے، آپ کسی کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس کی خداوندی نہ مان لیں اور جب حقیقت میں کسی کی خداوندی آپ مان چکے ہیں تو اس کی بندگی اور اطاعت سے کسی طرح باز بھی نہیں رہ سکتا، کیا انسان اتنا احمق ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا حکم مانتا چلا جائے؛ درآں حالیکہ وہ اس کے حقِ حکمرانی کو تسلیم نہ کرتا ہو اور نہ انسان میں اتنی جرأت موجود ہے کہ جس کو فی الواقع وہ اپنے قلب وروح میں حاکم ذی اختیار سمجھتا ہو اور جسے نافع وضار اور پروردگار مانتا ہو اس کی اطاعت سے منہ موڑ جائے؛ پس درحقیقت خداوندی کے اعتراف اور بندگی واطاعت کے عمل میں لازم وملزوم کا تعلق ہے اور یہ عین عقل اور منطق کا تقاضہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہر پہلو سے کامل توافق ہو، آقائی اور خداوندی میں توحید، لامحالہ بندگی واطاعت میں توحید پر منتج ہوگی اور آقائی وخداوندی میں شرک کا نتیجہ لازماً بندگی واطاعت میں شرک ہوگا، آپ ایک کو خداوند سمجھیں گے تو ایک ہی کی بندگی بھی کریں گے دس کی خداوندی تسلیم کریں گے تو بندگی واطاعت کا رُخ بھی ان دسیوں کی طرف پھرے گا یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ خداوندی تو ایک کی مان رہے ہوں اور بندگی دس کی بجالائیں یا خداوندی دس کی تسلیم کر رہے ہوں اور اطاعت ایک کی کریں۔

ذاتِ خداوندی کا تعین لامحالہ سمتِ بندگی کے تعین پر منتج ہوگا، آپ جس کی خداوندی کا اعتراف کرینگے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوندی ایک کی مانیں اور اطاعت دوسرے کی کریں، تعارض کا امکان زبانی اعتراف اور واقعی بندگی میں تو ضرور ممکن ہے؛ مگر قلب وروح کے حقیقی احساس وشعور اور جوارح کے عمل میں ہرگز ممکن نہیں، کوئی عقل اس چیز کو تصور نہیں کرسکتی کہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہے ہیں اس کے بجائے آپ کی بندگی کا رُخ کسی ایسی ہستی کی طرف پھر سکتا ہے جس کا بندہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوں، بخلاف اس کے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس کی طرف آپ کی بندگی کا رُخ پھر رہا ہے اس کی خداوندی کا نقش دراصل آپ کے ذہن پر مرتسم ہے؛ خواہ زبان سے آپ اس کے سوا کسی اور کی خداوندی کا اظہار کر رہے ہوں، خداوند کے اعتراف اور بندگی کے احساس میں کمی بیشی لازماً اطاعت امر کی کمی بیشی پر منتج ہوگی، کسی کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کا احساس آپ کے دل میں جتنا زیادہ شدید ہوگا اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اس کی اطاعت کریں گے اور اس احساس میں جتنی کمزوری ہوگی اتنی ہی اطاعت میں کمی واقع ہوگی؛ حتی کہ اگر یہ احساس بالکل نہ ہو تو اطاعت بھی بالکل نہ ہوگی۔

ان مقامات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مدعا اللہ تعالیٰ کی خداوندی کا اقرار کرانے اور اس کے سوا ہر ایک کی خداوندی کا انکار کرا دینے سے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی واطاعت نہ کرے، جب وہ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (الزمر:۳) کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت خالصاً ومخلصاً صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے کسی دوسری مستقل بالذات اطاعت کی آمیزش اس کے ساتھ نہیں ہوسکتی، جب وہ کہتا ہے کہ وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینہ:۵) تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی کی بندگی

کرنے پر انسان مامور ہے اور اس کی بندگی کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اس کی اطاعت کے ساتھ کسی دوسرے کی اطاعت مخلوط نہ کرے، جب وہ کہتا ہے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ (الأنفال:۳۹) تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی اطاعت پوری کی پوری اللہ تعالیٰ ہی کے لیے وقف ہے اور ہر اس اطاعت سے مسلمان کی جنگ ہے جو اس اطاعت میں حصہ بٹانا چاہتی ہو، جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مسلمان خداوند عالم کے ساتھ اس کی اطاعت بھی کرے یا خداوندِ عالم کے بجائے صرف اسی کی اطاعت کرے؛ پھر جب وہ کہتا ہے هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (التوبہ:۳۳) تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو، اطاعت اور بندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ اطاعتِ الٰہی کے نیچے آجائے جس کی فرمانبرداری بھی ہو، خداوند عالم کی اجازت کے تحت ہو اور جن کی فرمانبرداری کے لیے وہاں کا حکم یا سندِ جواز نہ ملے اس کا بند کاٹ ڈالا جائے، یہ اس دینِ حق اور اس ہدایت کا تقاضہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ بھیجتا ہے، اس تقاضے کے مطابق خواہ انسان کے ماں باپ ہوں؛ خواہ خاندان اور سوسائٹی ہو؛ خواہ قوم اور حکومت ہو؛ خواہ امیر یا لیڈر ہو؛ خواہ علماء و مشائخ ہوں؛ خواہ وہ شخص یا ادارہ ہو جس کی انسان خدمت کر کے پیٹ پالتا ہے اور خواہ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشات ہوں کسی کی اطاعت بھی خداوند عالم کی اصل اور بنیادی اطاعت کی قید سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی، اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے جو اس کی خداوندی کا اقرار کر چکا ہے اور جس نے اس کے لیے اپنی بندگی کو خالص کر دیا، وہ جس کی اطاعت بھی کرے گا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت رہ کر کریگا جس حد تک جس کی بات ماننے کی وہاں سے اجازت ہوگی اسی حد تک مانے گا اور جہاں اجازت کی حد ختم ہو جائے گی وہاں وہ ہر ایک کا باغی اور صرف اللہ کا فرمانبردار نکلے گا۔

روزہ کا مقصد آدمی کو اسی اطاعت کی تربیت دیتا ہے، وہ مہینہ بھر تک روزآنہ کئی کئی گھنٹے آدمی کو اس حالت میں رکھتا ہے کہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی اس کو خداوند عالم کے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، غذا کا ایک ریزہ اور پانی کا ایک قطرہ تک وہ حلق سے گزار نہیں سکتا، جب تک وہاں سے اجازت نہ ملے، ایک ایک چیز کے استعمال کے لیے وہ شریعتِ خداوندی کی طرف دیکھتا ہے، جو کچھ وہاں حلال ہے وہ اس کے لیے حلال ہے؛ خواہ تمام دنیا اسے حرام کرنے پر متفق ہو جائے اور جو کچھ وہاں حرام ہے وہ اس کے لیے حرام ہے خواہ ساری دنیا مل کر اسے حلال کر دے، اس حالت میں خدائے واحد کے علاوہ کسی کا اذن اس کے لیے اذن نہیں، کسی کا حکم اس کے لیے حکم نہیں اور کسی کی نہی اس کے لیے نہی نہیں؛ خود اپنے نفس کی خواہش سے لیکر دنیا کے ہر انسان اور ہر ادارے تک کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کے حکم سے مسلمان رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہو یا توڑ سکتا ہو، اس معاملہ میں نہ بیٹے پر باپ کی اطاعت ہے نہ بیوی پر شوہر کی، نہ ملازم پر آقا کی، نہ رعیت پر حکومت کی، نہ پیرو پر لیڈر و امام کی، نہ مرید پر پیر کی؛ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی بڑی اور اصلی اطاعت تمام اطاعتوں پر مقدم ہے اور ۲۰/۷ گھنٹے کی اس طویل مشق و تمرین سے روزہ دار کے دل پر **کالنقش فی الحجر** یہ سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہی مالک کا وہ بندہ ہے، ایک ہی قانون کا پیرو ہے اور ایک ہی اطاعت کا حلقہ اس کی گردن میں پڑا ہے؛ اس طرح یہ روزہ انسان کی فرمانبرداریوں اور اطاعتوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر ایک مرکزی اطاعت کی طرف پھیر دیتا ہے اور تیس دن تک روزآنہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹے اسی سمت میں جمائے رکھتا ہے؛ تاکہ اپنی بندگی کا مرجع اور اپنی اطاعت کے مرکز کو وہ اچھی طرح متحقق کر لے اور رمضان کے بعد جب اس ڈسپلن کے بند کھول دیئے جائیں تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداریاں بکھر کر مختلف مرجعوں کی طرف بھٹک نہ جائیں، اطاعت امر کی اس تربیت کے لیے انسان کی صرف دو خواہشوں (یعنی غذا لینے کی خواہش اور صنفی خواہش) کو چھانٹ لیا گیا ہے اور ڈسپلن کی ساری پابندیاں صرف انہیں دو پر لگائی گئی ہیں؛ لیکن روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور اپنی بندگی و غلامی کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گزارے کہ ہر اس چیز سے رکے جس سے خدا نے روکا ہے اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے، روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشو نما دینا ہے، نہ کہ کھانے پینے اور مباشرت سے روکنا؛ لہٰذا یہ کیفیت جتنی زیادہ ہو روزہ اتنا ہی مکمل ہے اور جتنی اس میں کمی ہے اتنا ہی ناقص ہے؛ اگر کسی نے روزہ اس احمقانہ طریقہ پر رکھا کہ جن جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے ان سے تو پرہیز کرتا رہا اور باقی ان تمام افعال کا ارتکاب کرتا چلا گیا جنھیں خدا نے حرام کیا ہے تو اس کے روزے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش کہ اس میں وہ اعضا تو سب کے سب موجود ہیں جن سے صورتِ انسانی بنتی ہے؛ مگر جان نہیں ہے، جس کی وجہ سے انسان انسان ہے؛ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا؛ یہی بات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ ''جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اس کی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا

چھوڑ دے'' جھوٹ بولنے کے ساتھ جھوٹ پر عمل کرنے کا لفظ جو فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے دراصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ حقیقت میں خود اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے، روزہ کا اصل مقصد تو عمل سے اس اقرار کی تصدیق ہی کرنا تھا مگر جب وہ روزے کے دوران میں اسی کی تکذیب کرتا ہے تو پھر بھوک اور پیاس کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اس کے خلوئے معدہ کی کوئی حاجت نہ تھی؛ اسی بات کو دوسرے انداز میں حضورؐ نے اس طرح بیان فرمایا ہے'' کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزہ سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں جنھیں اس قیام سے رات جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا'' اور یہی بات ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح تر الفاظ میں فرمادیا ہے کہ: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرۃ:۱۸۳) ترجمہ: تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، توقع ہے کہ تم تقویٰ کرنے لگو گے؛ یعنی روزے فرض کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو جائے، تقویٰ کے اصل معنی خذر اور خوف کے ہیں، اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد خدا سے ڈرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا ہے، اس لفظ کی بہترین تفسیر وہ ہے جو حضرت ابی ابن کعبؓ نے بیان کی، حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا امیر المؤمنین! آپ کو کبھی ایسے راستے سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ تنگ ہو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا بارہا! انھوں نے پوچھا تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ دامن کانٹوں میں نہ اُلجھ جائے، حضرت ابیؓ نے کہا بس اسی کا نام تقویٰ ہے، زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے دونوں طرف افراط وتفریط، خواہشات اور میلاناتِ نفس اور وساوس وترغیبات، گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، اس راستہ پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعتِ حق کی راہ سے ہٹ کر بداندیشی وبدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا یہی تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے ہیں، یہ ایک مقوی دوا ہے جس کے اندر خدا ترسی اور راست روی کی قوت بخشنے کی خاصیت ہے؛ مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی استعداد پر موقوف ہے؛ اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے اور جو قوت روزہ دیتا ہے اس کو لینے کے لیے تیار ہو اور روزے کی مدد سے اپنے اندر خوفِ خدا اور اطاعتِ امر کی صفت کو نشو نما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں تک وہ زندگی کی سیدھی شاہراہ پر دونوں طرف کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچائے ہوئے چل سکتا ہے، اس صورت میں اس کے لیے روزے کے اجر وثواب کی کوئی حد نہیں؛ لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو کر محض روزہ نہ توڑنے ہی کو روزہ رکھنا سمجھے اور تقویٰ کی صفت حاصل کرنے کی طرف توجہ ہی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں بھوک پیاس اور رات جگے کے سوا کچھ نہیں پا سکتا؛ اسی لیے نبیؐ نے فرمایا: '' آدمی کا ہر عمل خدا کے یہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے ایک نیکی دس گنی سات سو گنی تک پھلتی پھولتی ہے؛ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے، وہ میری مرضی پر موقوف ہے جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں'' یعنی روزہ کے معاملہ میں بالیدگی وافزونی کا امکان بے حد وحساب ہے، آدمی اس سے تقویٰ حاصل کرنے کی جتنی کوشش کرے اتنا ہی وہ بڑھ سکتا ہے صفر کے درجہ سے لیکر اوپر لاکھوں کڑوڑوں اربوں گنے تک وہ جا سکتا ہے؛ بلکہ بے نہایت ترقی کر سکتا؛ پس یہ معاملہ چونکہ آدمی کی اپنی استعدادِ اخذ وقبول پر منحصر ہے کہ روزہ سے تقویٰ حاصل کرے یا نہ کرے اور کرے تو کس حد تک کرے اس وجہ سے آیتِ مذکورہ بالا میں یہ نہیں فرمایا کہ روزہ رکھنے سے تم یقیناً متقی بن جاؤ گے؛ بلکہ لَعَلَّكُمْ کا لفظ فرمایا جس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ توقع کی جاتی ہے یا ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو۔

تعمیرِ سیرت: یہ تقویٰ ہی دراصل اسلامی سیرت کی جان ہے، جس نوعیت کا کیرکٹر اسلام ہر مسلمان فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا اساسی تصور اسی تقویٰ کے لفظ میں پوشیدہ ہے، افسوس ہے کہ آج کل اس لفظ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طرز کی شکل ووضع بنالینا چند مشہور نمایاں گناہوں سے بچنا اور بعض ایسے مکروہات سے پرہیز کرنا جنھوں نے عوام کی نگاہ میں اہمیت اختیار کر لی ہے؛ بس اسی کا نام تقویٰ ہے؛ حالانکہ دراصل یہ ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو انسان زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں لپیٹ لیتی ہے، قرآن مجید انسانی طرزِ خیال وطرزِ عمل کو اُصولی حیثیت سے دو بڑی تقسیموں پر تقسیم کرتا ہے: ایک قسم وہ ہے جس میں انسان دنیوی طاقتوں کے ماسوا کسی بالاتر اقتدار کو اپنے اوپر نگران نہیں سمجھتا اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے کسی مافوق البشر حاکم کے سامنے جوابدہی نہیں کرنی ہے، دنیوی زندگی ہی کو زندگی، دنیوی فائدے ہی کو فائدہ اور دنیوی نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اسی بنا پر کسی طریقے کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی وروحانی فضائل کو بے وقعت سمجھتا ہے اور

مادی نقصانات کے مقابلہ میں اخلاقی وروحانی نقصانات کو ہلکا خیال کرتا ہے، کسی مستقل اخلاقی دستور کی پابندی نہیں کرتا؛ بلکہ موقع ومحل کے حساب سے خود ہی اخلاقی اُصول وضع کرتا ہے اور دوسرے موقع پر خود ہی ان کو بدل دیتا ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو ایسے بالاتر حکمران کا تابع اور اس کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے جو عالم الغیب والشہادۃ ہے اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے ایک روز اپنی دنیوی زندگی کے پورے کارنامے کا حساب اس حاکم کو دینا ہے، دنیوی زندگی کو اصل حیاتِ انسانی کا صرف ایک ابتدائی مرحلہ سمجھتا ہے اور ان فوائد ونقصانات کو جو اس مرحلہ میں ظاہر ہوتے ہیں عارضی اور دھوکہ دینے والے نتائج خیال کرتا ہے اور اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ ان مستقل فائدوں اور نقصانات کی بنیاد پر کرتا ہے، جو آخرت کی پائدار زندگی میں ظاہر ہونگے، مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی وروحانی فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کی بہ نسبت اخلاقی دستور کی پابندی کرتا ہے، جس میں اپنی اغراض ومصالح کے لحاظ سے اس کو ترمیم وتنسیخ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے، ان میں سے پہلی قسم کے طرزِ خیال وطرزِ عمل کا جامع نام قرآن نے ''فجور'' رکھا ہے اور دوسرے طرزِ خیال وطرزِ عمل کو وہ تقویٰ کے نام سے یاد کرتا ہے، یہ دراصل زندگی کے دو مختلف راستے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں اور اپنے نقطۂ آغاز سے لیکر نقطۂ انجام تک کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے، فجور کے راستہ کو اختیار کر کے آدمی کی پوری زندگی اپنے تمام اجزاء اور تمام شعبوں کے ساتھ ایک خاص ڈھنگ پر لگ جاتی ہے جس میں تقویٰ کی اشکالی تو کہیں نظر آسکتی ہے؛ مگر تقویٰ کی اسپرٹ کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا کیونکہ فجور کے تمام فکری اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں اور تقویٰ کے فکری اجزاء میں سے کسی چیز کو بھی ان کے مربوط نظام میں راہ نہیں مل سکتی، اس کے برعکس تقویٰ کا راستہ اختیار کر کے انسان کی پوری زندگی کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی طرز پر سوچتا ہے، دنیا کے ہر معاملہ اور ہر مسئلہ کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر موقع ومحل پر ایک دوسرا ہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہے، ان دونوں راستوں کا فرق صرف انفرادی زندگی ہی سے تعلق نہیں رکھتا؛ بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے جو جماعت فاجر افراد پر مشتمل ہوگی یا جس میں فاجرین کی اکثریت ہوگی اور اہلِ فجور کے ہاتھ میں جس کی قیادت ہوگی اس کا پورا تمدن فاجرانہ ہوگا، اس کی معاشرت میں، اس کی اخلاقیات میں، اس کی معاشیات میں، اس کی سیاست میں، اس کی نظامِ تعلیم وتربیت میں، اس کے بین الاقوامی رویہ میں، غرض اس کی ہر چیز میں فجور کی روح کارفرما ہوگی، یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے اکثر یا بعض افراد ذاتی خود غرضیوں اور منفعت پرستیوں سے بالاتر نظر آئیں مگر زیادہ سے زیادہ جس بلندی پر وہ چڑھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو اس قوم کے مفاد میں گم کردیں جس کی ترقی سے ان کی اپنی ترقی، جس کے تنزل سے ان کا اپنا تنزل وابستہ ہوگا؛ لہٰذا اگر کسی شخصی سیرت میں فجور کا رنگ کم بھی ہو تو اس سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا، قومی رویہ بہرحال افادیت، ابن الوقتی، مصلحت پرستی اور مادہ پرستی ہی کے اُصولوں پر چلے گا؛ اسی طرح تقویٰ بھی محض انفرادی چیز نہیں ہے، جب کوئی جماعت متقین پر مشتمل ہوتی ہے اور متقی ہی اُن کے رہنما ہوتے ہیں تو اس کے پورے اجتماعی رویہ میں ہر حیثیت سے خدا ترسی کا رنگ ہوتا ہے، وہ وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کے لحاظ سے اپنا طرزِ عمل مقرر نہیں کرتی؛ بلکہ ایک مستقل دستور پر عمل کرتی ہے اور ایک اٹل نصب العین کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کردیتی ہے، قطع نظر اس سے کہ دنیوی لحاظ سے قوم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے یا نقصان پہنچتا ہے، وہ مادی فائدوں کے پیچھے نہیں دوڑتی؛ بلکہ پائدار اخلاقی وروحانی منافع کو اپنا مطمحِ نظر بناتی ہے نہ وہ مواقع کے لحاظ سے اُصول توڑتی اور نہ بناتی ہے؛ بلکہ ہر حال میں اُصولِ حق کا اتباع کرتی ہے؛ کیونکہ اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کے مدمقابل قوموں کی طاقت کم ہے یا زیادہ؛ بلکہ اوپر جو خدا موجود ہے وہ اس سے ڈرتی ہے اور اس کے سامنے کھڑے ہوکر جوابدہی کا جو وقت بہرحال آنا ہے اس کی فکر اسے کھائے جاتی ہے۔

انسانی تباہی کا اصل سبب: اسلام کے نزدیک دنیا میں فساد کی جڑ اور انسانیت کی تباہی وبربادی کا اصل سبب فجور ہے، وہ اس فجور کے سانپ کو ہلاک کردینا چاہتا ہے یا کم از کم اس کے زہریلے دانت توڑ دینا چاہتا ہے؛ تاکہ اگر یہ سانپ جیتا رہے تب بھی انسانیت کو ڈسنے کی طاقت اس میں باقی نہ رہے، اس کام کے لیے وہ نوعِ انسانی میں سے ان لوگوں کو چن چن کر نکالنا اور اپنی پارٹی میں بھرتی کرنا چاہتا ہے جو متقیانہ رجحان طبع رکھتے ہوں، فجور کی جانب ذہنی رجحان رکھنے والے لوگ اس کے کسی کام کے نہیں خواہ وہ اتفاق سے مسلمانوں کے گھر میں پیدا کیے گئے ہوں اور مسلم قوم کے درد میں کتنے ہی تڑپتے ہوں، اسے دراصل ضرورت ان لوگوں کی ہے جن میں خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جو آپ اپنا حساب لینے والے ہوں، جو خود اپنے دل کی نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھیں، جن کو قانون کی پابندیوں کے لیے کسی خارجی دباؤ کی حاجت نہ ہو؛ بلکہ خود اُن کے اپنے باطن میں ایک محاسب اور آمر بیٹھا ہو جو انہیں اندر سے قانون کا پابند بناتا ہو اور ایسی قانون شکنی پر بھی روکتا ٹوکتا ہو جس کا علم کسی پولیس، کسی عدالت اور کسی رائے عام کو نہیں ہوسکتا اور ایسے افراد چاہتا ہے

جنھیں یقین ہو کہ ایک آنکھ انہیں ہر حال میں دیکھ رہی ہے جنھیں خوف ہو کہ ایک عدالت کے سامنے بہر حال انہیں جانا ہے، جو دنیوی منافع کے بندے ہنگامی مصالح کے غلام اور شخصی یا قومی اغراض کے پرستار نہ ہوں، جن کی نظر آخرت کی اصل وحقیقی نتائج پر جمی ہوئی ہو، جن کو دنیا کے بڑے سے بڑے لالچ یا سخت سے سخت نقصان کا خوف بھی خداوندِ عالم کے دیئے ہوئے نصب العین اور اس کے بتائے ہوئے اُصولِ اخلاق سے نہ ہٹا سکتا ہو، جن کی تمام سعی وکوشش صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو، جنھیں اس امر کا پختہ یقین ہو کہ آخر کار بندگیٔ حق ہی کا نتیجہ بہتر اور بندگیٔ باطل ہی کا انجام برا ہوگا، چاہے اس دنیا میں معاملہ برعکس ہو؛ پھر اس کو جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ ایسے آدمی ہیں جن کے اندر اتنا صبر موجود ہے کہ ایک صحیح اور بلند نصب العین کے لیے برسوں بلکہ ساری عمر لگاتار سعی بے حاصل کر سکتے ہیں، جن میں اتنی ثابت قدمی ہو کہ غلط راستوں کی آسانیاں فائدے اور لطف ولذت کوئی چیز بھی ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتی ہو، جن میں اتنا تحمل ہو کہ حق کے راستہ پر چلنے میں خواہ کسی قدر ناکامیوں، مشکلات، خطرات، مصائب اور شدائد کا سامنا ہو ان کا قدم نہ ڈگمگائے، جن میں اتنی یکسوئی ہو کہ ہر قسم کی عارضی اور ہنگامی مصلحتوں سے نگاہ پھیر کر اپنے نصب العین کی طرف بڑھے چلے جائیں، جن میں اتنا توکل موجود ہو کہ حق پرستی وحق پوشی کے دیر طلب اور دور رس نتائج کے لیے خداوندِ عالم پر بھروسہ کر سکیں؛ خواہ دنیا کی زندگی میں اس کام کے نتائج سرے سے برآمد ہوتے ہی نظر نہ آئیں؛ ایسے ہی لوگوں کی سیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور جو کام اسلام اپنے متبعین سے لینا چاہتا ہے اس کے لیے ایسے ہی قابلِ اعتماد کارکنوں کی ضرورت ہے۔

کردار کی بالیدگی: تقویٰ کی اس صفت کا ھیولیٰ (ابتدائی جوہر) جن لوگوں میں موجود ہو، ان کے اندر اس صفت کی نشوونما دینے اور مستحکم کرنے کے لیے روزہ سے زیادہ طاقتور اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا، روزے کے ضابطہ پر ایک نگاہ ڈالیے آپ پر خود منکشف ہونے لگے گا کہ یہ چیز کس مکمل طریقہ سے ان صفات کو بالیدگی اور پائداری بخشتی ہے، ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ روزہ خدا نے تم پر فرض کیا ہے، صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ پیو، لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے اگر تم نے پرہیز کیا اور در پردہ کھاتے پیتے رہے تو خواہ لوگوں کے نزدیک تمہارا شمار روزہ داروں میں ہو؛ مگر خدا کے نزدیک نہ ہوگا، تمہارا روزہ صحیح اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ خدا کے لیے رکھو؛ ورنہ دوسری غرض مثلاً صحت کی درستی یا نیک نامی کے لیے رکھو گے تو خدا کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں، خدا کے لیے اپنا روزہ پورا کرو گے تو اس دنیا میں کوئی انعام نہ ملے گا اور توڑ دو گے یا نہ رکھو گے تو یہاں کوئی سزا نہ دی جائے گی مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے پیش ہو گے اسی وقت انعام بھی ملے گا اور اسی وقت سزا بھی دی جائے گی یہ چند ہدایات دیکر آدمی کو چھوڑ دیا جاتا ہے کوئی سپاہی کوئی سی آئی ڈی (C.I.D) کا آدمی اس پر مقرر نہیں کیا جاتا کہ ہر وقت اس کی نگرانی کرے، زیادہ سے زیادہ رائے عامہ اپنے دباؤ سے اس کو اس حد تک مجبور کر سکتی ہے کہ دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے پیئے؛ مگر چوری چھپے کھانے پینے سے اس کو روکنے والا کوئی نہیں اور اس بات کا حساب لینا تو کسی رائے عام یا کسی حکومت کے بس ہی میں نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے یا کسی اور نیت سے، ایسی حالت میں جو شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے غور کیجئے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں:

(۱) اس کو خداوندِ عالم کی ہستی کا، اس کے عالم غیب ہونے، کا اس کے قادرِ مطلق ہونے کا اور اس کے سامنے اپنے محکوم اور جوابدہ ہونے کا کامل یقین ہے اور پوری مدت میں جب کہ وہ روزہ سے رہا ہے اس کی نیت میں ذرا تنزل نہیں آیا (۲) اس کو آخرت پر، اس کے حساب کتاب پر، اس کی جزا وسزا پر پورا یقین ہے اور یہ یقین بھی کم از کم ان بارہ چودہ گھنٹوں میں برابر غیر متزلزل رہا ہے جب کہ وہ اپنے روزہ کے شرائط پر قائم رہا (۳) اس کے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے، وہ اپنی نیت کا خود محتسب ہے، اپنے دل کے حال پر خود نگرانی کرتا ہے، خارج میں قانون شکنی یا گناہ کا صدور ہونے سے پہلے جب نفس کے اندرونی تہوں میں اس کی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی وقت وہ اپنی قوتِ ارادی سے اس کا استیصال کر دیتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ پابندیٔ قانون کے لیے خارج میں کسی دباؤ کا وہ محتاج نہیں ہے (۴) مادیت واخلاق وروحانیت کے درمیان انتخاب کا جب اسے موقع دیا گیا تو اس نے اخلاق وروحانیت کو انتخاب کیا، دنیا وآخرت میں ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی، اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدہ کی خاطر مادی نقصان وتکلیف کو اس نے گوارا کیا اور آخرت کی نفع کی خاطر دنیوی مضرت کو قبول کر لیا (۵) وہ اپنے آپ کو اِس معاملہ میں آزاد نہیں سمجھتا کہ اپنی سہولت دیکھ کر اچھے موسم، مناسب وقت اور فرصت کے زمانے میں روزہ رکھے؛ بلکہ جو وقت قانون میں مقرر کر دیا گیا ہے اسی وقت روزہ رکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے؛ خواہ موسم کیسا ہی سخت ہو، حالات کیسے ہی ناسازگار ہوں اور اس کی ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے اس وقت روزہ رکھنا کتنا ہی نقصان دہ ہو۔

(۶) اس میں صبر، استقامت، تحمل، یکسوئی، توکل اور دنیوی ترغیبات وتحریصات کے مقابلہ کی طاقت کم از کم اس حد تک موجود ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کیا گیا ہے، اس کام کے دوران میں وہ رضا کارانہ اپنی خواہشاتِ نفس کو روکتا ہے، سخت گرمی کی حالت میں پیاس سے حلق چٹختا جارہا ہے برفاب سامنے موجود ہے آسانی سے پی سکتا ہے مگر نہیں پیتا، بھوک کے مارے جان پر بن رہی ہے کھانا حاضر ہے چاہے تو کھا سکتا ہے مگر نہیں کھاتا، جوان میاں بیوی میں خواہشِ نفس زور کرتی ہے چاہیں تو اس طرح قضائے شہوت کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے مگر نہیں کرتے، ممکن الحصول فائدوں سے یہ صرفِ نظر اور ممکن الاحتراز نقصانات کی پذیرائی اور خود اپنے منتخب کیے ہوطریقِ حق پر یہ ثابت قدمی کسی ایسے نفع کی اُمید پر نہیں ہے جو اس دنیا ہی میں حاصل ہونے والا ہو بلکہ ایسے مقصد کے لیے ہے جس کے متعلق پہلے ہی نوٹس دیدیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے اس کے حاصل ہونے کی اُمید ہی نہ رکھو۔

یہ کیفیات ہیں جو پہلے روزہ کا ارادہ کرتے ہی انسان کے نفس میں اُبھرنی شروع ہوتی ہیں، جب وہ عملاً روزہ رکھتا ہے تو یہ بالفعل ایک طاقت بن جاتی ہے، جب تیس دن تک مسلسل وہ اسی فعل کی تکرار کرتا ہے تو یہ طاقت راسخ ہوتی چلی جاتی ہے اور بالغ ہونے کے بعد سے مرتے دم تک تمام عمر ایسے ہی تیس تیس روزے ہر سال رکھنے سے وہ آدمی کی جبلت میں پیوست ہوکر رہ جاتی ہے، یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہے کہ یہ صفات صرف روزے ہی رکھنے میں اور صرف رمضان ہی کے مہینہ میں کام آئیں؛ بلکہ اس لیے ہے کہ ان ہی اجزاء سے انسان کی سیرت کا خمیر بنے وہ فجور سے یکسر خالی ہو اور اس کی ساری زندگی تقویٰ پر پڑ جائے۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے روزے سے بہتر کوئی طریقِ تربیت ممکن ہے؟ کیا اس کے بجائے اسلامی طرز کی سیرت بنانے کے لیے کوئی دوسرا کورس تجویز کیا جاسکتا ہے؟۔

ضبطِ نفس: اس تربیت کے ضابطہ میں کسنے کے لیے صرف دو ہی خواہشوں کو منتخب کیا گیا ہے، یعنی شہوتِ شکم اور شہوتِ فرج اور اُن کے ساتھ ایک تیسری خواہش آرام لینے کی خواہش بھی زد میں آگئی ہے؛ کیونکہ تراویح کے قیام اور سحری کے لیے آخری شب میں مزے کی نیند توڑ کر اُٹھنے کی وجہ سے اس پر بھی اچھی خاصی ضرب پڑتی ہے، حیوانی زندگی کے مطالبات میں یہ تین مطالبے اصل و بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں، بقائے نفس کے لیے غذا کا مطالبہ، بقائے نوع کے لیے صنفِ مقابل سے اتصال کا مطالبہ، اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال کرنے کے لیے آرام کا مطالبہ، ان ہی تینوں ضرورتوں کا تقاضہ تمام حیوانی خواہشات کا مبدا اور تمام حیوانی اعمال کا محرک ہے اور یہ تقاضہ اتنا طاقتور ہے کہ حیوان جو کچھ کرتا ہے اسی کے زور سے مجبور ہوکر کرتا ہے، انسان کو خدمتگار اور آلۂ کار کی حیثیت سے جو بہترین ساخت کا حیوان (جسم) دیا گیا ہے اس کے بنیادی مطالبات بھی یہی تین ہیں اور چونکہ وہ تمام حیوانات سے اونچی قسم کا حیوان ہے اس لیے اس کے مطالبات بھی ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں، وہ صرف زندہ رہنے کے لیے ہی غذا نہیں مانگتا بلکہ اچھی غذا مانگتا ہے، طرح طرح کی مزیدار غذائیں مانگتا ہے، غذائی مواد کی نئی ترکیبوں کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے اس مطالبہ میں اتنی شاخیں نکلتی چلی جاتی ہیں کہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک دنیا کی دنیا درکار ہوتی ہے، وہ صرف بقائے نوع کے لیے صنفِ مقابل سے اتصال ہی کا مطالبہ نہیں کرتا؛ بلکہ اس مطالبہ میں ہزار نزاکتیں اور ہزار باریکیاں پیدا کرتا ہے، تنوع چاہتا ہے، آرائش کے بے شمار سامان چاہتا ہے؛ غرض اس سلسلہ میں بھی اس کے مطالبات اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ کہیں جاکر ان کا سلسلہ رُکتا ہی نہیں؛ اسی طرح اس کی آرام طلبی بھی عام حیوانات کے مثل صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی حد تک نہیں رہتیں؛ بلکہ وہ بھی بے شمار شاخیں نکالتی ہیں جن کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا، وہ صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال نہیں کرنا چاہتا ہے؛ بلکہ چاہتا ہے کہ حتی الامکان قوتیں کھونے کی نوبت ہی نہ آنے پائے، مشقت سے جی چراتا ہے، محنت کے بغیر کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کی تدبیریں اس غرض کے لیے نکالتا ہے کہ بلا محنت یا کم از کم محنت سے مقصد براری ہوجائے اور خصوصاً ایسے مقاصد کے لیے محنت کرنے میں تو اس کی جان پر بنتی ہے جو اس کے حیوانی مقصد سے بالاتر ہوں۔

اس طرح ان تینوں ابتدائی خواہشوں سے خواہشات کا ایک لامتناہی جال بن جاتا ہے، جو انسان کی پوری زندگی کو اپنے لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے، پس دراصل انسان کے اس خادم اس منھ زور حیوان کے پاس یہی تین ہتھیار ہیں جن کی طاقت سے وہ انسان کا خادم بننے کے بجائے خود انسان کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ زور لگاتا رہتا ہے کہ اس کے اور انسان کے تعلق کی نوعیت صحیح فطری نوعیت کے برعکس ہوجائے، یعنی بجائے اس کے کہ انسان اس پر سوار ہو الٹا وہ انسان پر سوار ہوکر اسے اپنی خواہشات کے مطابق کھینچے کھینچے پھرے؛ اگر انسان پوری قوت سے اپنا اقتدار

اس پر مسلط نہ کرے اور تمیز وارادے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو بالآخر وہ اس پر غالب آجاتا ہے پھر وہ اپنے خدمتگار کا غلام اور اس کا خدمتگار اس کا آقا ہوتا ہے، علم اسماء کی جو نعمت اللہ تعالیٰ نے اس کو دی ہے فکر واستدلال اور تسخیر وایجاد کی جو قابلیتیں اسے عطا کی ہیں وہ سب کی سب اس اندھے جاہل، نادان جانور کی خدمت میں لگ جاتی ہیں، بلندیوں پر اڑنے کے بجائے پستیوں میں اُترنے کے کام آتی ہیں، اعلیٰ درجہ کے انسانی مقاصد کی جگہ ذلیل حیوانی مقاصد حاصل کرنے کا آلہ بن جاتی ہیں، ان کا کوئی مصرف اس کے سوا باقی نہیں رہتا کہ رات دن بس اسی حیوان کی خواہشات پوری کرنے کے لیے نئے نئے وسائل تلاش کرتی رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حیوان شَرُّ الدَّوَابِّ تمام حیوانات سے بدتر قسم کا حیوان بن کر رہ جاتا ہے، بھلا جس حیوان کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے انسان جیسا خادم مل جائے اس کی شر کی بھی کوئی حد ہوسکتی ہے؟ جس بیل کی بھوک کو بحری بیڑا بنانے کی قابلیت میسر آجائے زمین کی کس چراگاہ میں اتنا بل بوتا ہے کہ اس کی معاشی مفاد کی لپیٹ میں آنے سے بچ جائے، جس کتے کی حرص کو ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے کی طاقت مل جائے کس بوٹی اور ہڈی کا یارا ہے کہ اس کی کچلیوں کی گرفت میں آنے سے انکار کردے؟ جس بھیڑیئے کو اپنے جنگل کے بھیڑیوں کی قومیت بنانے کا سلیقہ ہو اور جو پریس اور پروپیگنڈے سے لے کر لمبی مار کی توپوں تک سے کام لے سکتا ہو، زمین میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ اس کے لیے کافی شکار فراہم کرسکے؟ جس بکرے کی شہوت ناول، ڈرامہ، تصویر، موسیقی، رقص، ایکٹنگ اور حسن افزائی کے وسائل ایجاد کرسکتی ہو، جس میں بکریوں کی تربیت کے لیے کالج، کلب، فلمستان تک پیدا کرنے کی لیاقت ہو اس کی دادِعیش کے لیے کون حد وانتہا مقرر کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے؟؛ ان پستیوں میں گرنے سے انسان کو بچانے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اس کے سامنے انسانی زندگی کا اصل نصب العین پیش کیا جائے اور اسے انسانی قوتوں کا صحیح مصرف بتایا جائے؛ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس حیوان کے ساتھ اس کے تعلق کی جو فطری نوعیت ہے اس کو عملاً قائم کیا جائے اور مشق وتمرین کے ذریعہ سے سوار کو اتنا چست کردیا جائے کہ وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھے، ارادے کی باگیں مضبوطی کے ساتھ تھامے اور اس پر اتنا قابو یافتہ ہو کہ اس کی خواہشات کے پیچھے خود نہ چلے بلکہ اپنے ارادے کے مطابق اسے سیدھا چلائے، اس حیوان کو خدا نے ہمارے سپرد اس لیے کیا ہے کہ ہم اس سے کام لیں اور اس کو اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں، اس کا دماغ ہمارے لیے فکر کرنے کا وسیلہ ہے، اس کے آلاتِ حواس ہمارے لیے علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، اس کے ہاتھ اور پاؤں ہمارے لیے سعی وعمل کرنے کے آلات ہیں، جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہمارے لیے مسخر کی ہیں ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز یہی حیوانی جسم ہے اس کے اندر جتنی فطری خواہشات ہیں وہ سب اس کی حقیقی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں جن کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے، ہم پر اس کا حق ہے کہ اسے آرام سے رکھیں، اس کو قوت بخش غذا دیں، بقائے نوع کے لیے اس کی طلب کو پورا کریں اور اسے خواہ مخواہ ضائع نہ کریں؛ لیکن بہرِحال یہ ہماری اور ہمارے مقصدِ زندگی کی خدمت کے لیے ہے نہ کہ ہم اس کی اور اس کے مقصدِ زندگی کی خدمت کے لیے، اس کو ہمارے ارادے کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ ہمیں اس کی خواہشات کا تابع، اس کا مرتبہ یہ نہیں ہے کہ ایک فرمانروا کی طرح اپنی خواہشات ہم سے پوری کرائے بلکہ اس کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ ایک غلام کی طرح ہمارے سامنے اپنی خواہشات پیش کرے اور یہ ہماری تمیز اور تربیت یافتہ خودی کا کام ہے کہ اس کی جس درخواست کو جب اور جس طرح مناسب سمجھیں پورا کریں یا رد کریں۔

روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر یہی اقتدار بخشنا ہے جو تین خواہشیں تمام حیوانی خواہشات کا مبدا ہیں، جو تین ہتھیار اس حیوان کے پاس ایسے طاقتور ہیں کہ ان کے زور سے یہ ہمیں اپنا مطیع بنانے کے لیے اُٹھتا ہے روزہ انہیں تینوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے منہ میں مضبوط لگام دیکر اس کی راسیں ہماری اس خودی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو خدا پر ایمان لائی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا عزم کرچکی ہے، اس وقت اس جانور کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، صبح سے شام تک یہ دانہ پانی مانگتا رہتا ہے اور ہم اس کو کچھ نہیں دیتے، یہ پانی کی طرف لپکنا چاہتی ہے؛ مگر ہم باگیں کھینچ لیتے ہیں، یہ کھانا دیکھ کر اس پر منہ مارنا چاہتا ہے؛ مگر ہم اسے جنبش نہیں کرنے دیتے، یہ کہتا ہے اچھا سگریٹ، حقہ، پان کسی چیز سے تو مجھے اپنی آگ بجھا لینے دو؛ مگر ہم اس کی ہر درخواست کو رد کردیتے ہیں، یہ اپنے جوڑے کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے اور ملاعبت شروع کردیتا ہے مگر جہاں تسکین نفس کا سوال بیچ میں آیا اور ہم نے لگام کھینچ لی، اس طرح دن بھر اس کی خواہشوں کو ٹھکرانے کے بعد ہم اپنے مالک کے مقرر کئے ہوئے وقت پر اسے چارہ پانی دیتے ہیں، اب یہ تھکا ہارا چاہتا ہے کہ ذرا آرام لے مگر عشا کی اذان سنتے ہی ہم کان پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کرتے ہیں اور مسجد کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، دوسرے دنوں میں تو اسے عشاء کے وقت تھوڑا ہی قیام کرنا پڑتا تھا؛ مگر رمضان میں معمولی نماز کے علاوہ تراویح کی غیر معمولی رکعتوں کے لیے بھی ہم اسے کھڑا رکھتے ہیں، اس رگید سے نکل کر بے چارا سونے کے لیے دوڑتا ہے کہ بس صبح کی خبر لائے مگر رات کے پچھلے پہر میں جب کہ

اس کا رُواں رُواں میٹھی نیند میں سرشار ہوتا ہے ہم ایک چابک ایسا رسید کرتے ہیں کہ سارا نشہ ہرن ہوجاتا ہے؛ پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مالک کا حکم دن کے بجائے اس وقت دانہ پانی دینے کا ہے؛ لہٰذا جو کچھ کھانا چاہتا ہے کھالے، یہ مشق ہے جو ہمیں ہر سال تیس دن تک کرائی جاتی ہے تاکہ ہمیں اپنے اس خادم پر پورا اقتدار پر حاصل ہوجائے، اس سے ہم اپنے جسم اور جسمانی قوتوں کے بااختیار حاکم بن جاتے ہیں، حیوانی خواہشات کی جابرانہ قہرمانی ختم ہوجاتی ہے، ہم میں اتنی طاقت پیدا ہوجاتی ہے کہ اپنی جس خواہش کو جس حد پر چاہیں روک دیں اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں، وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت ہی نہ رہی ہو، جو نفس کے ہر مطالبہ پر بے چوں وچرا سر جھکا دینے کا خوگر ہورہا ہو اور جس کے لیے حیوانی جبلت کا ہر داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو صحیح ہے دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا، بڑے درجہ کا کام انجام دینے کے لیے بہرحال آدمی کی خودی میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ وہ نفس کی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھ سکے اور ان قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے نفس وجسم میں ودیعت کی ہیں اپنے ارادہ کے مطابق استعمال کرسکے؛ اسی لیے رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ سال کے دوران میں کبھی کبھی نفل روزے بھی رکھنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ اس اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتی رہے؛ لیکن بہت فرق اُصولی اور جوہری فرق ہے اس اقتدار میں جو اسلامی روزہ انسان کی خودی کو اس کے نفس وجسم پر دیتا ہے اور اس اقتدار میں جو غیر اسلامی طرز پر نفس کشی کی مشقوں یا قوتِ ارادی کو نشوونما دینے کی ورزش سے حاصل کیا جاتا ہے یا جو فطری طور پر بڑے آدمیوں کو خود بخود حاصل ہوتا ہے، یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایک ایسی جاہل مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع، کسی ضابطہ وقانون کی پابند اور کسی علم صحیح کی متبع نہیں ہے، اس کو اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر جو فرماں روائی ہوتی ہے لازم نہیں بلکہ ممکن نہیں کہ اسے وہ صحیح مقصد کے لیے اور صحیح طریقہ پر استعمال کرے، دنیا میں سنیاس، رہبانیت اور ترکِ لذات کی بیماریاں اسی نوعیت کے اقتدار سے پیدا ہوئی ہیں؛ اسی اقتدار کی بدولت نفس اور جسم کے جائز حقوق چھینے گئے ہیں، اسی اقتدار کے بل پر انسان خود اپنی فطرت سے لڑا ہے؛ اسی اقتدار کی بدولت انسان نے اپنی قابلیتوں کو تہذیب وتمدن کے ارتقا میں صرف کرنے کے بجائے تنزل وانحطاط کی کوششوں میں صرف کیا ہے؛ اسی اقتدار کی بدولت دنیا کے بہت سے بڑے آدمیوں نے خدا کے بندوں پر اپنی خدائی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طاقتوں کو حق کے بجائے ظلم کی راہ میں استعمال کیا ہے، اس کے برعکس اسلامی روزہ جس خودی کو نفس وجسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں ہے جو آپ اپنی رہنما ہو بلکہ ایسی خودی ہے جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت العلم، کتاب منیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے، وہ خدا کے دیئے ہوئے نفس وجسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی کہ اس پر قابو پاکر اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح چاہے حکمرانی کرے؛ بلکہ وہ اسے خدا کی امانت سمجھتی ہے اور اس امانت پر خدا کے منشا کے مطابق حکومت کرتی ہے، ایک مؤمن ومتقی انسان جس کی خودی اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سپر ڈال چکی ہو، دنیا کی کسی چیز پر بھی ظلم نہیں کرسکتا، چہ جائیکہ کہ خود اپنے جسم کا حق مارے اور اپنے اس رفیق پر ظلم کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے مدت العمر کے لیے اس کا بہترین مددگار بنایا ہے، وہ اس کو اچھے سے اچھا کھلائے گا، اچھے سے اچھا پہنائے گا، بہتر سے بہتر مکان میں رکھے گا، زیادہ سے زیادہ آرام دے گا، اس کے ہر فطری جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا، نہ اس لیے کہ اس کا نفس یہ چاہتا ہے بلکہ اس لیے کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے اور اس حق کو ادا کرنا خدا کی خوشی کا موجب ہے؛ البتہ وہی نفس جب اچھا کھانے کے لیے حرام غذا یا حرام کمائی کا تقاضہ کریگا، جب اچھا لباس، اچھی سواری، اچھے مکان کے لیے ایسی تدبیریں اختیار کرنے کا مطالبہ کرے گا جنھیں اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا ہے، جب وہ اپنے جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے ایسے دروازے کھولنا چاہے گا جنھیں اللہ تعالیٰ نے بند کیا ہے، جب وہ اپنی آرام طلبی کے لیے ان فریضوں اور خدمتوں کو ادا کرنے سے جی چرائے گا جو اللہ تعالیٰ نے اس پر عائد کئے ہیں اور جب وہ اس جگہ اپنی خواہش اور خود اپنی قربانی دینے سے رکنا چاہے گا جہاں اللہ تعالیٰ کی رضا ہے کہ اس کی خواہشوں کو قربان کردیا جائے گا وہاں مؤمن کی خودی اپنے حاکمانہ اختیارات کو پوری شدت کے ساتھ استعمال کرے گی اور اس کو سرکشی ونافرمانی کے راستہ سے ہٹا کر فرماں برداری کے سیدھے راستہ پر لے جائے گی؛ اسی چیز کی مشق مؤمن سے رمضان میں کرائی جاتی ہے؛ تاکہ دنیا کی اس امتحان گاہ میں جب نازک مواقع پیش آئیں اور وہ ہر روز ہر وقت پیش آتے ہیں تو اس کے ارادہ کی باگیں اس منھ زور حیوان کو قابو میں رکھنے سے عاجز نہ رہ جائیں۔

انفرادی تربیت کا اجمالی نقشہ: یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق افراد کی تربیت سے تھا، اب روزہ کے اجتماعی پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ایک مجموعی نظر انفرادی تربیت کے اس پروگرام پر ڈال لیجئے، اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر وصلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے؛ مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے اور ان اُصولوں کی بنیاد پر ایک نظام تمدن بنادینے پر اکتفا نہیں کرتا؛ بلکہ ساتھ ساتھ اپنی

جماعتی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے؛ تاکہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو ان میں کا ایک ایک شخص اپنے خیالات اپنی سیرت اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس و روح کی پوری آمادگی اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدہ اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے، اس اسکیم میں روزہ کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) اس تربیت کے ذریعہ جماعت کے ہر فرد کو خداوندِ عالم کی حاکمیت کے مقابلہ میں اپنی خودمختاری سے عملاً دستبردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے تا آنکہ وہ اپنی پوری زندگی کو قانونِ الٰہی کے تابع کر دے (۲) ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ مشق و تمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر نہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے قانونِ الٰہی کی خفیہ اور علانیہ اطاعت کرنے لگے (۳) ہر فرد کے اندر یہ روح پھونک دی جائے کہ ماسوا اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ تعالیٰ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سند نہ ہو اس کی اطاعت کے لیے مردِ مؤمن کے نفس میں کوئی امادگی بھی نہ ہو (۴) ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدہ اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے اس میں صبر و تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ اور ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آ جائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے؛ یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اُس شخص پر فرض کیے ہیں جو امتِ مسلمہ کا رکن ہو، کوئی عاقل و بالغ فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، بیماری سفر اور بعض دوسرے شرعی اعذار کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اس پر قضا یا فدیہ لازم ہے؛ بہرحال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسانی روزے کی فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے۔

اگرچہ لازم نہیں کہ روزہ کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں؛ کیونکہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لیے خود تربیت لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے؛ لیکن بجائے خود اس نظام تربیت کی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا؛ اگر کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے دنیا میں اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع و ہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری کی پوری آبادیاں اس کے دائرے میں آ کر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں؛ پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جزو بن کر نہ رہ سکتا ہو تو وہ خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے جہاں اس نے بغیر عذرِ شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً یہ بات سوسائٹی پر آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک شخص ایسا موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے، اس صریح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بروقت علم ہو جاتا ہے اور اس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس زہر سے محفوظ کر لے کم از کم اسلام نے تو اپنی حد تک ایسے لوگوں کی نشاندہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لیے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا تو ان کی اصلاح کرے یا انھیں اپنے دائرہ سے خارج کر دے، اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ نہ اُٹھائے اور ایسے لوگوں کو نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے؛ بلکہ انہیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔

روزہ کا اجتماعی پہلو: نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے؛ لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے؛ اسی طرح روزہ کو ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا ہے؛ اگر شارع کے پیشِ نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے یہ حکم دینا کافی تھا کہ مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی بھی تیس دن کے روزے رکھ لیا کرے، اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے؛ بلکہ ضبطِ نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی

افراد کے لیے پیدا ہوجاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوتِ ارادی استعمال کرنی پڑتی؛ لیکن اسلام کا قانون جس حکیم پروردگار نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ایک جماعتِ صالحہ وجود میں نہ آئے اس لیے اس نے روزہ کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا؛ بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزہ کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظام تربیت جس سے افراد تیار ہوں ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہوجائے، اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی وروحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کئے جاتے ہیں۔

تقویٰ کی فضاء: اجتماعی عمل کی اوّلین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہوجاتی ہے ایک شخص انفرادی طور پر کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گردوپیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہیں تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا، اس کی کیفیت ذہنی صرف اس کی ذات تک محدود اور صرف اس کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی، اس کو نشوونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی؛ بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے اُلٹا گھٹا دیں گے لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو؛ اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا، اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا الگ بے حد وحساب بڑھتی چلی جائے گی، ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گردوپیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا، بے حیائی کی کتنی بڑی مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی؟ اور پھر بھی ماحول کے مختلف اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بیچاری کو پھٹکنے کا بھی موقع نہ ملے گا اور ایک شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پا کر افزوں درافزوں ہوتی چلی جائے گی، ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہلک جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہامت وحماست کا طوفان امنڈ آتا ہے، جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے، نیکی ہو یا بدی، دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے، جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش بے حیائی اور بدکاری کے جذبات ابل پڑتے ہیں اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آجاتا ہے، جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں؛ خواہ تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دیکر رمضان المبارک سے شارع نے یہی کام لیا ہے، جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے؛ اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر وصلاح اور تقویٰ وطہارت کا موسم ہے جن میں برائیاں دبتی ہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوفِ خدا اور حبِ خیر کی روح چھا جاتی ہے اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے، اس زمانے میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے، ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے، ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے، اس وقت لوگوں کے دل نرم ہوجاتے ہیں، ظلم سے ہاتھ رُک جاتے ہیں، برائی سے ہاتھ رُک جاتے ہیں، برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہوجاتی ہے، توبہ اور خشیت وانابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہوجاتے ہیں اور بدولی کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس عملی سے اس کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہوجاتا ہے؛ غرض اس حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینہ کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے، اس کو پاکیزہ کیا جاتا رہے، اس کی کایا پلٹی جائے اور اس مجموعی خشیت سے روحِ اسلامی کو از سرِ نو زندہ کر دیا جائے؛ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب رمضان آجاتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں'' ایک دوسری حدیث میں ہے: ''جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن باندھ دیئے جاتے ہیں، دوزخ کی طرف جانے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کی طرف جانے والے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے: ''اے بھلائی کرنے والے! آگے بڑھ اور برائی کے خواہشمند ٹھہر جا''۔

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں اگر آئینہ کے اوپر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے؛ ورنہ اس کی زندگی کی آخری اُمید بھی منقطع ہو جاتی ہے؛ اسی طرح مسلمانوں کی بستی کا تمھیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو؛ اگر اس مہینہ میں اس کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوفِ خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا ابھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہیں؛ اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں اور اسلامی حس مردہ نظر آئے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لو، اس کے بعد زندگی کی کوئی سانس ''مسلمان'' کے لیے مقدر نہیں ہے۔

اجتماعی احساس: اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے، نسل یا زبان یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا، آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہو یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اس سے کبھی دل نہیں ملتا خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں، جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے؛ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت، رفاقت، یکجہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی، قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے؛ خواہ نیکی ہو یا بدی دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتے ہیں، چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں شراب نوشی کا اشتراک بھی یوں ہی برادری پیدا کرتا ہے؛ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے، جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے، اس لیے ایسے راستوں میں برادری کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی، برخلاف اس کے نیکی کے راستہ میں نفسانیت دبتی ہے، انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے؛ اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز باجماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری پیدا کرتے ہیں تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا؛ اس کی رضا کے لیے بھوک و پیاس کی تکلیف اُٹھانا؛ اسی کے خوف سے برائیوں کو چھوڑنا، ایک دوسرے کو برائیوں سے روکنا؛ اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اُکسانا یہ چیز ان میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری قومیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت اور ایسی ہمدردی اور رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

امدادِ باہمی کی روح: اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے؛ اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب؛ لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گزرتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد کرنے پر اُکساتا ہے، بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے؛ مگر اس کے اخلاقی اور تمدنی فوائد بے شمار ہیں جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان سے عملی ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو؛ بلکہ فرداً فرداً بھی حاجتمندوں کو تلاش کر کے پہنچائی جاتی ہو وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے؛ بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت شکرگزاری و احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ طبقاتی جنگ رونما نہیں ہوتی جو ان قوموں میں ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے؟۔

یہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دیکر تیار کرتا ہے اور پھر انہیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے، اسلام کا آخری مقصد جس مدنیتِ صالحہ کو وجود میں لانا اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز روزے کے ذریعہ تیار کئے جاتے ہیں، اس کے سپاہی اور جنرل، عہدیدار، اہلکار، وزراء، معلم اور پروفیسر، قاضی، مفتی، تاجر، مزدور، کارخانہ دار، کسان اس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح تمدنی و سیاسی نظام بن سکے جس کا اسلام اپنے متبعین سے مطالبہ کرتا ہے۔